R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date— 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷۔ شمارہ ۵	ایڈیٹر آل احمد سرور	یکم فروری ۱۹۶۸ء

اداریہ

مرکزی زبان کے سلسلے میں کشمکش

مرکزی زبان کے سلسلے میں جو تناؤ اور تشدد ہوا ہے وہ کسی طرح ملک کے لیے فال نیک نہیں ہے۔ چونکہ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور اس میں کئی بڑی ترقی زبانیں ہیں جن کی ایک شاندار تاریخ ہے اور جن کے پیچھے صدیوں کا چلن ہے اور جن کا ادبی خزانہ بھی بہت سے ترقیوں سے جڑا ہوا ہے، اس لیے یہ مانتے ہوئے کہ بالآخر ایک ہندوستانی زبان کو انگریزی کی جگہ لینا ہے ہمیں ہندی یا کسی اور زبان کو کسی نہ کسی طرح سب پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس معاملے میں سب کی سہولت اور رضامندی کے اصول کو مقدم رکھنا چاہیے خواہ ہندی یا کسی اور زبان کے مرکزی زبان ہونے میں کچھ دیر ہی کیوں نہ لگے۔ افسوس ہے کہ یہ نقطۂ نظر عام نہیں ہے۔ اور ایک طرف کچھ ہندی ریاستوں والے انگریزی کو خارج کرنے میں جلدی سے کام لے رہے ہیں اور یہاں تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ تشدد آمیز مظاہرے کرنے، انگریزی کے سائن بورڈ ہٹانے اور انگریزی ناموں کی تختیاں توڑنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تو دوسری طرف جنوب میں اسکولوں سے ہندی کو خارج کیا جا رہا ہے۔ صرف تامل اور انگریزی پڑھنے کو کافی سمجھا گیا ہے اور ریلوں پر ہندی کے خلاف نعرے لکھنے اور ہنگامے برپا کرنے کا میلان خاصے زوروں پر ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ان مظاہروں میں بنیادی چیز زبان نہیں سیاست ہے جو زبان کے ساتھ جذباتی وابستگی کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس قسم کے ہنگاموں سے ہندی یا تامل کی کوئی خدمت نہیں ہوتی، ہاں قومی دولت برباد ہوتی ہے، ملک میں تشدد بڑھتا ہے اور ملک کے ایک حصے کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں سے ذہنی اعتبار سے دور ہوتے جاتے ہیں، یعنی نقصان قومیت اور یک جہتی کے تصور کو پہنچتا ہے اور پورا ملک کمزور ہوتا ہے۔ اس وقت جب غذا کا مسئلہ، روزگار کا مسئلہ اور اشیا کی گرانی

قبول شکلیں ہے ہیں۔ زبان کے نام پر ہنگامے کرنا اور پورے ملک کی ترقی کو روکنا ہی نہیں، بلکہ اس ترقی کو اور مشکل بنا دیتا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ پھر سے اس بات کی کوشش کی جائے کہ تمام سیاسی پارٹیاں، ماہرین لسانیات معلم اور قومی کارکن مل کر بیٹھیں اور زبان کے مسئلے کا ایک ایسا حل نکالیں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے آج کچھ لوگوں کے انگریزی پر اصرار کے معنی یہ نہ لینا چاہییں کہ وہ انگریزی کو ہمیشہ کے لیے مرکزی سرکاری زبان کی حیثیت سے باقی رکھنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مدت تک انگریزی کو مشترک زبان کی حیثیت سے رکھنا مفید ہوگا جس میں جنوبی ہند والے اپنی زبان کے علاوہ کسی دوسری ہندوستانی زبان مثلاً ہندی میں اس حد تک مہارت حاصل کر لیں کہ انھیں ہندی والوں سے مقابلہ کرنے میں پس و پیش نہ ہو۔ مرکزی زبان کا مسئلہ بلاشبہ اہم ہے مگر ہندوستان کی تمام زبانوں کا اپنے اپنے علاقے میں ترقی کرنا اور انھیں اعلیٰ تعلیم کے قابل بنانا زیادہ اہم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام دو ایک سال میں نہ ہو سکے گا، مگر اس کا آغاز تو ہو جانا چاہیے تاکہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ساری اعلیٰ تعلیم جدید ہندوستانی زبانوں کے ذریعے سے دی جا سکے۔ اس طرح اپنے اپنے علاقے میں وہاں کے بیشتر باسیوں کے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، مگر اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے ایسے طلبہ کے لیے جو یونیورسٹیوں میں اور مرکز کی ملازمتوں میں کام کرنے کے اہل ہیں، اپنی علاقائی یا مادری زبان کے علاوہ ایک ہندوستانی زبان اور انگریزی کا جاننا پھر بھی ہمارے نزدیک لازمی ہونا چاہیے۔ عام طالب علم پر تین یا چار زبانوں کا بار ڈالنا مناسب نہ ہو، مگر اچھے اور ذہین طلبہ کے لیے چار زبانیں جاننا مشکل نہ ہونا چاہیے اور اس لیے ہمارے نزدیک یونیورسٹی کے طالب علم کو اپنی ریاستی یا مادری زبان کے علاوہ انگریزی اور ایک ہندوستانی زبان ضرور جاننی چاہیے۔ اگر اس بات پر ہر حال میں نظر رہے کہ ایسے مسائل میں مجموعی فکر اور مجموعی رائے کو زیادہ اہمیت دی جائے گی اور کوئی گروہ اپنا نقطۂ نظر منوانے کی کوشش نہ کرے گا تو یہ لسانی جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں، ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ یہ ملک کی سالمیت کو سخت نقصان پہنچائیں گے اور قومی یک جہتی اور امن و اتحاد کا سارا نقشہ بگڑ جائے گا۔ آج وسیع النظری، وسیع القلبی اور ذہنی رواداری کی جتنی ضرورت ہے اتنی کبھی [illegible]

خاندان، خاندان کے تمام افراد کی مرضی اور سہولت کے مطابق چلتا ہے ایک فرد یا ایک گروہ کی سہولت کے مطابق نہیں۔ کاش یہ احساس عام ہو سکے۔

فراق اور دوسرے شاعروں اور فنکاروں کو اعزاز

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب کے یوم جمہوریت کے موقع پر صدر جمہوریہ کی طرف سے اردو کے چوٹی کے شاعر حضرت فراق گورکھپوری کو پدم بھوشن کا اعزاز دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملیالی کے مشہور شاعر شنکر کروپ کو بھی یہ اعزاز ملا ہے۔ مرہٹی کے ممتاز شاعر مسٹر بیندرے اور مشہور فنکار بیگم اختر کو پدم شری کا اعزاز ملا ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی گرانقدر خدمات کا یہ اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت سماج میں ان کی اہمیت سے واقف ہے اور ادب و فن کی قدر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعزاز سے یہ ادیب اور فنکار بڑے نہیں ہو گئے۔ ہاں حکومت کے اعزاز سے حکومت کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ ادارہ ہماری زبان حضرت فراق کو خصوصاً اور دوسروں کو عموماً ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔

ہماری زبان کے چندے میں ایک روپیہ کا اضافہ

ہم نے کچھ دن ہوئے ہماری زبان کے چندے میں ایک روپیہ کا اضافہ تجویز کیا تھا اور پڑھنے والوں سے رائے مانگی تھی۔ اس سلسلے میں جو خطوط ہمارے پاس آئے ہیں ان میں اس اضافے کی پرجوش حمایت کی گئی ہے اور ہماری زبان میں جو اضافے کئے گئے ہیں وہ بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں چنانچہ یکم فروری ۱۹۶۸ء سے ہماری زبان کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہو گا اور خریداروں کا حساب اس کے مطابق رکھا جائے گا۔ خریداروں کو دفتر سے اس کی اطلاع بھی مل جائے گی۔

ممتاز غزل گو سراج لکھنوی کا انتقال

لکھنؤ۔ اردو کے ممتاز شاعر دبستان لکھنؤ کے آخری نمائندے قابل تعداد ادبی انجمنوں کے سرپرست اور شعراء کی خاصی تعداد کے استاد حضرت سراج الحسن سراج لکھنوی کا ۲۳ جنوری کو صبح ۹ بجے اپنے مکان واقع کٹرہ ابوتراب خاں میں اچانک انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔

مرحوم ۲۰ سال قبل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سے خون کے دباؤ میں مبتلا ہو گئے تھے جس کا دورہ رہ رہ کر پڑا کرتا تھا وفات سے کچھ دنوں قبل مرحوم اسی دورے کی وجہ سے فرش ہو گئے تھے۔ سراج صاحب نے ۱۹۱۰ء سے شاعری شروع کی اور اسی وقت مشہور استاد مرحوم پیارے صاحب رشید لکھنوی کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ صرف کچھ دنوں پیارے صاحب کے بھائی باقر صاحب عقید لکھنوی کو بھی کلام دکھایا مگر جلد ہی اپنے اساتذہ کی رائے سے وہ اصلاح سے مستغنی ہو گئے۔ لکھنؤ کی تاریخی ادبی انجمنوں معین الادب، بہار ادب، معراج ادب اور فردوس ادب کی تشکیل میں مرحوم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ معراج ادب کے مرحوم جنرل سکریٹری اور حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی مرحوم صدر تھے۔ بہار ادب میں اگرچہ مرحوم نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا لیکن اس کے سب سے سرگرم ممبر رہے۔ ادارہ ہماری زبان مرحوم کی وفات پر اپنے رنج و غم اور پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

بدیع الزماں خاور

جگنو کی روشنی

جب چاند تھک گیا
اور
آسمان بادلوں سے ڈھک گیا
جنگل کے بیچ
اندھیرے میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو
دفعتاً
احساس ہوا
کہ پتیوں میں چمکنے والے ایک حقیر کیڑے کی
روشنی ———
کتنی عظیم ہوتی ہے!!

ہندوستانی کتابیں پاکستان میں ناجائز طور پر نہ چھپ سکیں گی

لاہور میں ایک سرکاری ترجمان نے اعلان کیا ہے کہ ایک قانون کے تحت جو لوگ بھی غیر ملکی کتاب چھاپنا چاہیں گے ان کو اس کے لیے حکومت سے پہلے اجازت لینی ہوگی اور جو کتابیں چھاپی جا چکی ہیں ان کے لیے ۲ ماہ کے اندر سرکاری اجازت حاصل کرنا ہوگی۔ سرکاری ترجمان نے کہا کہ اس آرڈیننس کا مقصد کتابوں کے جعلی اڈیشن کے ذریعہ پبلشر منافع خوری نہ کر سکیں اور ادبی چوری نہ کر سکیں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اب کوئی بھی کتاب مصنف کی اجازت کے بغیر نہ چھپ سکے گی۔

لکھنؤ میں شاعروں اور ادیبوں کی کانفرنس

لکھنؤ۔ یہاں ۳ اپریل سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک کانفرنس شروع ہو رہی ہے جو چار دن تک جاری رہے گی۔ اس میں اس بات پر غور کیا جائے گا کہ جمہوریت میں ادیبوں اور شاعروں کا رول کیا ہونا چاہئے۔ اس میں ادب کے نئے رجحانات پر بھی تبادلہ خیالات کیا جائے گا۔

پریم پال اشک

تقریظ قندیلِ حرم

پچھلے سال انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رام پور کے زیرِ اہتمام پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ایک تقریظ بعنوان "تقریظ قندیلِ حرم" شائع کی گئی تھی اور اسے سرشار کی اولین تصنیف بھی قرار دیا گیا ہے۔ اسے عابد رضا بیدار اور مسرت حسین آزاد نے مرتب کیا ہے۔ اس میں متن کے علاوہ "تقریب" کے زیرِ عنوان پیش لفظ یا دیباچے کے لیے ۲۰ صفحات وقف کیے گئے ہیں۔

بقول مرتبین قندیلِ حرم نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی فارسی تصنیف ہے جو ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے ۱۳ صفحات ہیں۔ اسے مطبع حسینی ملقب بہ نجیب المطابع رامپور نے شائع کیا تھا۔

سرشار کے علاوہ اس پر امیر مینائی نے فارسی میں ۷ صفحات کی ایک تقریظ لکھی تھی۔

یہ تصنیف حج بیت اللہ کی تقریب پر لکھی گئی۔ یہ تقریب فروری ۱۸۷۲ء کو ادا ہوئی۔

"تقریظ قندیلِ حرم" کسی بھی اعتبار سے اہمیت کی حامل نہیں اور تقریب کے زیرِ عنوان مرتبین نے جو دیباچہ یا پیش لفظ لکھا ہے اس میں ایسی بھلاوے میں ڈال دینے والی باتیں لکھی گئی ہیں جنھیں پڑھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔

دراصل اس سے محض زعمِ تحقیق کے سوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ کام نہ تو تحقیق کے تقاضے پورا کرتا ہے اور نہ ہی اس سے سرشار کے اسلوب کے انداز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ محض خوباں سے چھیڑ کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہی نہیں بلکہ اس کے مطالعہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہو دو مرتبین میں سے کسی نے بھی نہ تو سرشار کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اُن کی تصانیف کا غائر مطالعہ کیا۔

تقریب میں یہ عبارت درج ہے:۔

"یہ نثرِ رنگین (قندیلِ حرم) حج بیت اللہ کی تقریب پر لکھی گئی جو فروری ۱۸۷۲ء کو ادا ہوا۔ سرشار نے اسی نثر پر تقریظ لکھی جس کا واحد نسخہ (غالباً بخطِ مصنف) رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ کتاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ سرشار کی اردو میں اس فارسی کتاب پر تقریظ لکھی ہے جو بہ لحاظِ ظاہر کتاب کے سالِ اشاعت ۱۸۷۲ء کے قریب کی تصنیف ہونی چاہیے۔"

ایک سوال اٹھتا ہے کہ آیا ۱۶ صفحات کی ایک تقریظ کو تصنیف قرار بھی دیا جا سکتا ہے یا نہیں اس کا جواب یقینی طور پر نفی میں ملے گا۔ کیونکہ عام طور پر تصنیف سے مراد کتابی صورت میں منظرِ عام پر آنے والے کام سے لی جاتی ہے۔ تقاریظ یا دیباچوں کو تصانیف کی ذیل میں قطعاً شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اگر یہ کیفیت ہو تو ہر تصنیف میں مندرج تقاریظ اور دیباچوں یا پیش لفظوں کو تصانیف کی ذیل میں شامل کیا جائے۔ مثلاً غالب نے بھی تو کئی تقاریظ لکھی تھیں انھیں بھی تصانیف کیوں نہیں قرار دیا جاتا۔ عین یہی کیفیت دیگر شعرا اور ادبا کی ہے۔

لہٰذا "تقریظ قندیلِ حرم" کو سرشار کی تصنیف تو نہیں البتہ ایک تحریر ضرور کہا جا سکتا ہے۔

اب جہاں تک اس کے اولین ہونے کی بات ہے وہ بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ سرشار کی تحریریں ۱۸۷۲ء سے بہت پہلے مضامین کی شکل میں اس عہد کے موقر جرائد میں اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔ ان میں کشمیر درپن، مراسلۂ کشمیری، ریاض الاخبار اور مرآۃ الہند وغیرہ ہیں۔

ان کا پہلا مضمون مراسلۂ کشمیر میں ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا جبکہ وہ ضلع کھیری کے ایک اسکول میں مدرس تھے لہٰذا مذکورہ تقریظ کو سرشار کی اولین تحریر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

مرتبین نے لکھا ہے کہ اس تقریظ کا واحد نسخہ (غالباً بخطِ مصنف) رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ فاضل مرتبین نے لفظ "غالباً" کا سہارا لے کر حقِ تحقیق کا حق جس خوبی سے ادا کیا ہے اس کا جواب نہیں۔ جب تک محقق کو اپنی تحقیق پر پورا یقین نہ ہو اسے اس قسم کے مشکوک بیانات دے کر اپنا تو سیدھا کرنے اور زبان و ادب کے شیدائیوں کو بھلاوے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جب انھیں یقین ہی نہیں تھا کہ مذکورہ نسخہ مصنف کی اپنی تحریر اور خط میں موجود ہے تو ایسی مبہم اور مشکوک عبارت لکھنے کی ضرورت کیا تھی۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ کتاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ صاحب! اگر محقق خود اپنے کام کی اہمیت سے منکر ہو اور اس کی افادیت تسلیم نہ کرے تو باقی اسے کاہے کو گردانیں گے۔

اگر مذکورہ "تصنیف" کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی تو اتنا آڈمبر رچانے کی کیا ضرورت تھی؟

مرتبین نے مزید لکھا ہے:۔

"اس میں آپ کو بول چال کی زبان سلیس اور رواں دواں بنیادی نثر لکھنے والے سرشار کے بجائے بالکل دوسرا مصنف نظر آئے گا جس پر رجب علی بیگ سرور صاحب "فسانۂ عجائب" کا دھوکا ہوتا ہے۔ اسے "فسانۂ عجائب" کا فیضان کہیے یا اس عہد کا عام رنگ یا پھر اس کتاب کے انداز کی پیروی جس کی تقریظ لکھی جا رہی تھی۔ بہر صورت اتنا تو طے ہے کہ یہ سرشار کے عام رنگ کے

بالکل برخلاف مسجع و مقفیٰ نثرِ رنگین کا نمونہ ہے جو سرشار کے اپنے خاص رنگ کی بھی ضد ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ مرتبین سرور کو بھی نہیں سمجھ سکے بلکہ سرور و سرشار کے باہمی رنگ کو بھی نہ سمجھے۔ سرور نے ہمیشہ چیزوں کی عکاسی کی اور سرشار نے انسانوں کی ترجمانی کی۔ دراصل مغالطہ اس لیے ہو جاتا ہے کہ سرشار نے سرور کا تتبع کیا اور مسجع اور مقفیٰ انداز میں رنگین نثر لکھی۔

یہ امر دلچسپی سے خالی اور حقیقت سے بعید نہیں کہ سرشار نے اپنے ابتدائی مضامین مقفیٰ اور مسجع نثر ہی میں لکھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے فسانۂ آزاد کی جلد اول میں بیشتر مقفیٰ اور مسجع رنگین نثر ہی لکھی اور فسانۂ آزاد میں منظر نگاری کرتے وقت بھی مقفیٰ اور مسجع نثر ہی کا سہارا لیا ہے مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان کا خاص رنگ انسانوں کی ترجمانی اور زندہ جاوید، جیتے جاگتے اور ہنستے کھیلتے ماحول کی عکاسی میں نہاں ہے۔ سرور ماحول کی ترجمانی اور منظر کشی ان کا شیوہ نہیں یہی کیفیت تقریظ قندیل حرم کی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ تقریظ قندیل حرم کا رنگ سرشار کے عام رنگ کے بالکل برعکس اور ان کے خاص رنگ کی ضد ہے درست نہیں۔

یہ نکتہ ذرا وضاحت طلب ہے لہٰذا اپنی صفائی اور ثبوت کے طور پر سرور اور سرشار کی تصانیف کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"سبحان اللہ! الحمد اللہ! عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر باوضع وضعدار ہے۔ دو رویہ بازار کس انداز کا ہے ہر دوکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر چند ہر محلے میں جہان کا ساز و سامان مہیا ہے۔ پر اکبری دروازے سے جلوخانے اور کچے پل تک کیا صراط مستقیم ہے۔ کیا جلسہ ہے! نان پاؤ کی خوش سلیقہ۔ شیرمال کباب نان نہاری جہان کی نعمت اس آبداری کے ساتھ جس کی بو سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گذرے تو سونگھے! کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ دیر ہو دیکھے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سرخ سرخ پیازے سے نہاری کا بگھارنا، سر میں جھنکارنا! شیرمال شفق کے رنگ کی۔ خستہ ابھری ہوئی! ایک بار کھائے نان نعمت کا مزہ پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا پھرے ہمارے کباب اس آب و تاب کے کہ مرغ و ماہی کا دل سیخ اور پر حسرت محرومی سے کباب! ادرک کو بچھا میاں شیر اللہ کی دکان کا دل سے باریک کترا بانسہ نایاب۔"
(فسانۂ عجائب ص ۵)

اب سرشار کی شہرۂ آفاق تصنیف "فسانۂ آزاد" کا ایک اقتباس دیکھیے:-

"لکھنؤ میں ہر گلی کوچہ زعفران زار ہے۔ کیوں نہ ہو آخر بسنت کی بہار ہے۔ یوں تو ہر سمت جلسے چہل پہل، سارنگی کی چھیڑ چھاڑ اور نغمہ سرائی کا انتظام ہے۔ مگر شاہ مینا صاحب کی درگاہ سب میں زیادہ زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اللہ اکبر گرد مزار میں نوجوانوں کی وہ دھوم دھام ہے کہ جس طرف دیکھیے اژدہام عام ہے۔ غٹ کے غٹ جوق کے جوق چلے جاتے ہیں غول کے غول امڈے آتے ہیں۔ وہ بھیڑ بھاڑ، وہ دھکم دھکا، وہ ریل پیل، وہ شور و شر کہ الامان الحفیظ۔"
(فسانۂ آزاد جلد اول۔ ص ۲۱۲)

آخر میں تقریظ قندیل حرم کا ایک اقتباس توجہ طلب ہے:-

"غرضیکہ خیالات گوناگوں نے دل میں جگہ پائی تھی اور یہی دھن سمائی تھی کہ شاہان خلف سلطنت میں کس نے کیا کارنمایاں کیے اور ارکان سلطنت ماضیہ و حال میں سے کس نے کار متعلقہ بحسن و خوبی انجام دیے۔ جب کبھی کسی تاجدار نصفت شعار یا کسی حاکم نامدار رعایا کے یار غمگسار کا عدل یاد آتا تھا، پیوستہ دل نسیم مسرت کے اہتزاز اور باد طرب انگیز کے داب سے کھل جاتا تھا۔ اور جب کسی ظالم اظلم کے جور و ستم کی طرف خیال جاتا تھا کلیجہ منہ کو آتا تھا کہ وقت شام ہوا، دن قریب اختتام ہوا۔ آفتاب لب بام ہوا، مویشی مرغزار پر بہار سے آہستہ آہستہ بستی کی طرف جانے لگے۔ کسان بے چارے دن بھر کے تھکے ماندے مرے پٹے اپنی اپنی جھونپڑیوں کو آنے لگے۔"
(تقریظ قندیل حرم۔ ص ۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سرشار نے سرور کی تقلید کس حد تک کی اور "تقریظ قندیل حرم" سرشار کے عام اور خاص رنگ کی ضد ہے یا نمائندگی کرتی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

اردو زبان اس وقت جس نازک ترین دور سے گزر رہی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اردو کے نام لیوا محض ماتم اور واویلا یا مرثیہ خوانی اور مدح خوانی کے بجائے اس کی بقا اور ترقی کے لیے سنجیدگی سے غور کریں اور کچھ ٹھوس عملی اقدام کی طرف متوجہ ہوں۔ اس سلسلے میں جو مسائل بار بار ہمارے ذہن میں آتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) ہمارے بچوں کے لیے اردو کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ آئینی طور پر اردو کی جو بھی حیثیت ہو لیکن مرکزی اور صوبائی حکومتیں اس کی تعلیم کے سلسلے میں جو رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ کیا اردو کے بہی خواہ اگر واقعی اس زبان کو وہ اپنی زبان سمجھتے ہیں اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا اپنے طور پر کوئی انتظام نہیں کر سکتے؟

(۲) ہم اس بات پر تھوڑی دیر کے لیے خوش ہو لیتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں کے اعداد و شمار کی فہرست جب شائع ہوتی ہے تو اس میں اردو کا نمبر دوسرا بتایا جاتا ہے لیکن ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ہمارے ان اخبارات کی حیثیت اور نوعیت کیا ہے؟ اردو میں وہ کون سا روزنامہ اخبار ہے جو کتابت، طباعت، مضامین اور خبروں کی فراہمی، ایڈیٹروں، نامہ نگاروں اور اخبار کے عملے میں کام کرنے والوں کی فن صحافت سے واقفیت اور تعداد اشاعت کے اعتبار سے انگریزی میں نکلنے والے روزنامہ اخباروں سے تو بڑی بات ہے ہندی، گجراتی یا بنگالی میں نکلنے والے اخباروں کا بھی مقابلہ کر سکے؟

(۳) اردو زبان میں جو رسالے ہندوستان سے نکلتے ہیں ان کی صورت حال کے بارے میں ہم نے کبھی غور کیا ہے؟ ہمارے یہاں سے مختلف ادارے اخبار کس معیار کے نکلتے ہیں اور اگر وہ اپنے معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض حضرات شوقیہ طور پر اردو کا ادبی رسالہ نکالتے ہیں تو وہ کچھ ہی دنوں بعد دم توڑنے لگتا ہے اور آخر سسک سسک کر بند ہو جاتا ہے؟ کیا یہ بات درست نہیں کہ اردو کا ہر رسالہ تقریباً ایک ہی انداز کا ہوتا ہے، ہر پرچے میں گھوم پھر کر ایک ہی قسم کے مضامین اور ایک ہی نوعیت کا مواد ہوتا ہے؟ لکھنے والوں کی ایک بندھی ٹکی فہرست ہے جو اپنے افسانوں، غزلوں اور نظموں کے ساتھ ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ ہم اپنے لکھنے والوں کو معاوضہ نہیں دے سکتے اور نہ ان سے سنجیدہ مباحث پر مضامین لکھوا سکتے ہیں۔ ہمارے رسالوں کو اشتہار نہیں ملتے۔ ہمارے یہاں رسالے خرید کر پڑھنے کی عادت لوگوں کو کم ہے، عموماً لکھنے والے ہی ان کو اعزازی طور پر وصول کرتے ہیں اور وہ لوگ جن کے پاس اعزازی طور پر رسالہ نہیں آتا وہ بھی اسے مفت حاصل کر کے پڑھنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر رسالے کے ایڈیٹر کو شکایت رہتی ہے کہ اسے خریدار نہیں ملتے کچھ دن تک رسالہ خسارے میں نکلتا ہے آخر مرحوم ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بات ہمیں نہیں معلوم ہے کہ شمع، بیسویں صدی اور جاسوسی دنیا جیسے سستے رسالے ہمارے یہاں زیادہ مقبول ہیں اور علمی و تحقیقی اور اعلیٰ درجے کے ادبی پرچوں کے خریدار اتنے بھی نہیں جتنے ہمارے یہاں ادیب و شاعر ہیں؟

(۴) اردو زبان میں فحش اور مبتذل قسم کے ناولوں اور افسانوں کو شائع کرنے کے لیے ناشر اور انھیں فروخت کرنے کے لیے کتب فروش مل جاتے ہیں لیکن سنجیدہ کتابیں اپنے ناشر کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ بالآخر لکھنے والے کسی نہ کسی طور پر انھیں خود ہی شائع کرتے ہیں لیکن شائع کرنے کے بعد انھیں پشیمان ہونا پڑتا ہے کیونکہ اردو میں اچھی اور معیاری کتاب کا ایک ایڈیشن بھی مصنف کی زندگی میں ختم نہیں ہوتا۔ اس ایک ایڈیشن کی (جس کی تعداد ایک ہزار سے زائد کبھی نہیں ہوتی) خاصی تعداد مصنفین کو اپنے حلقۂ احباب میں تحفے کے طور پر پیش کرنی ہوتی ہے کیونکہ ہر لکھنے والے کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی تحریر کو بہرحال کچھ لوگ پڑھیں۔

(۵) اردو زبان میں لغت، انسائیکلوپیڈیا، تاریخ ادب اور

مدحت الاختر

غزل

رس بھرا ہو جہاں گھٹاؤں میں
چل کے رہیے اب ایسے گاؤں میں
دیکھتے رہ گئے جدھر دیکھا
تیری تصویر تھی فضاؤں میں
وہ بھلا میرے پاس کیوں آتے
پھول کھلتے نہیں چتاؤں میں
گھر کے بادل برس گئے لیکن
آگ پھیلی رہی دِشاؤں میں
اپنی آواز کھو کے آئے ہیں
وہ جو ہیں تیرے ہم نواؤں میں
کون سورج سے بچ کے رہتا ہے
دھوپ میں بیٹھیے کہ چھاؤں میں
ہم ابھی تک زمیں پہ ہیں مدحت
لوگ اڑنے لگے ہواؤں میں

اس نوعیت کی کتابیں جن کو لکھنے اور لکھوانے اور انھیں شائع کرنے کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے ان کی اسکیم اور ان سے متعلق منصوبے تو ہر جگہ تیار ہوتے ہیں لیکن کامیابی کہیں نہیں ہوتی۔

یہ تمام مسائل ایسے ہیں جن پر بعض لوگ سنجیدگی سے غور بھی کرتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد بھی کوئی بات بنتی نظر نہیں آتی۔ عموماً رونا یہی رویا جاتا ہے کہ ہمارے پاس وسائل نہیں، حکومت اور ریاست ہمارے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ کرتی ہے۔ دوسری زبانوں میں اخبارات کے مالک اور کتابوں کے ناشر بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں اور وہ اس کام پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن اردو والے غریب ہیں، ان کے پاس خلوص اور محبت تو ہے لیکن ان کی جیب خالی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے یہ باتیں ایک حد تک صحیح ہوں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر سال ہمارے ملک میں لاکھوں روپے صرف مشاعروں پر صرف ہوتے ہیں، اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شمع، بیسویں صدی اور ہما جیسے رسالے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں بکتے ہیں، جب یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ فحش اور گھٹیا ناول لکھنے والوں کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوتی کہ انھیں ناشر نہیں ملتے یا انھیں اپنی تحریر کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تو ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مشاعرے اردو زبان کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، وہ اس خوش خیالی میں مبتلا ہیں کہ اردو شاعری اب بھی عوام میں بے حد مقبول ہے اور شاید یہی مقبولیت اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن ان مشاعروں میں جس قسم کی شاعری ہمارے سامنے آتی ہے اور ان میں جس نوع کے شعرا کی کثرت ہوتی ہے یا بقول شاد عارفی یہاں اردو شاعری کی جو درگت بنتی ہے وہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ ابھی حال ہی میں دہلی کے لال قلعے میں اردو کا آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس کی صدارت وانچو صاحب (چیف جسٹس آف انڈیا) فرما رہے تھے انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ انھوں نے ایسے مشاعرے بہت دیکھے ہیں۔ معلوم نہیں موصوف نے مشاعروں کے سلسلے میں "دیکھنے" کا لفظ شعوری طور پر استعمال کیا یا غیر شعوری طور پر مگر واقعہ یہ ہے کہ اب مشاعرے "دیکھنے" ہی کی چیز رہ گئے ہیں۔ غالباً اسی لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں آج کے مشاعرے کو سرکس سے مشابہ بتایا ہے۔ عام طور پر جب یہ مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں تو ان کے انتظام و انصرام کے لیے ایک کمیٹی بھی مقرر کی جاتی ہے۔ اس کمیٹی میں بظاہر شہر کے معززین اور سنجیدہ حضرات ہوتے ہیں لیکن نہ جانے کون سی ایسی مصلحت کارفرما ہوتی ہے کہ زیادہ تر ایسے شاعروں کو پورے ملک سے مدعو کیا جاتا ہے جو شعر و ادب کی دنیا میں کسی اہم یا نمایاں حیثیت کے حامل نہیں ہوتے، فراق جیسے چند شاعر بطور تبرک رکھ لیے جاتے ہیں لیکن پورا ماحول ایسا ہوتا ہے جسے دیکھ کر نوٹنکی یا سرکس کے مسخرے یاد آئیں تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ کچھ حضرات اپنی وضع قطع، حلیہ اور ہیئت کذائی، قوالی اور فلمی انداز کے ترنم، ناز و ادا اور اپنے کلام کی سطحیت اور کم مائگی ہر اعتبار سے شاید عام طور پر سنجیدہ محفلوں میں بار نہ پاتے لیکن صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ان کے ناز منتظمین مشاعرہ اس طرح اٹھاتے ہیں کہ شاید عرسوں اور میلوں ٹھیلوں میں بھانڈوں اور قوالوں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر کسبیوں کی بھی [illegible] مشاعرے کی صدارت اور اس کے افتتاحی مراسم کے لیے کسی عالم و فاضل کے بجائے کسی منسٹر یا گورنر کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو اردو سے محض واجبی واقفیت رکھتا ہو۔ یہ صدر محض تھوڑی دیر کے لیے کرسی صدارت پر رونق افروز رہتا ہے پھر اسے کوئی "ضروری" کام پڑ جاتا ہے اور وہ رخصت ہو جاتا ہے۔ اس تھوڑی دیر کے وقفے میں اپنا کلام سنانے کے لیے شاعروں میں دھکم پیل بھی ہوتی ہے مبادا منسٹر یا گورنر صاحب اس سے ناواقف رہ جائیں۔ پھر ان مشاعروں کی ایک اور چیز قابل توجہ ہے، خواتین شاعرات اور مزاحیہ شاعروں کا استعمال۔ ان خواتین میں شاید ہی کوئی ایسی خاتون ہوں جن کے بارے میں گمان ہو سکے کہ یہ جو شعر سناتی ہیں وہ خود ان کی اپنی ملکیت ہیں، اکثر ان کا تلفظ صحیح نہیں ہوتا، تلفظ صحیح ہوتا ہے تو ادائیگی سے پتہ چل جاتا ہے کہ شعر کی ساخت ان کی گرفت میں نہیں آ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس چیز سے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں وہ ان کی شاعری نہیں چیزے دگر ہوتی ہے۔ ان کا کلام جس طرح لوگ سنتے ہیں اور داد دے کر تڑپ جاتے ہیں وہ ہماری تہذیب اور شائستگی پر ایک بدنما داغ ہے۔ پھر مزاحیہ شاعروں کی باری آتی ہے تو یہ مشاعرہ واقعی دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے یہاں کا مزاحیہ شاعر کیوں یہ سمجھتا ہے کہ اس کے کلام پر اسی وقت لوگ ہنسیں گے جب وہ کوئی گھٹیا اور سستا مزاح پیدا کرے گا یا کوئی عجیب آواز منہ سے نکالے گا۔ ان شعرا کے کلام پر مشاعرے کی رہی سہی فضا بھی بگڑ جاتی ہے اور وہ ہڑبونگ ہوتا ہے اور مجمع سے ایسی ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جنھیں سن کر شرافت آنکھیں نیچی کر لیتی ہے۔

مشاعرے کی یہ فضا کم و بیش اب ہر جگہ نظر آتی ہے یہی تمام بدتمیزیاں اور یہی تمام مناظر اب مشاعرے کے ایسا جزو بن گئے ہیں جن سے کسی صورت مفر نہیں۔ سنجیدہ شعرا کے ساتھ ان مشاعروں میں جو سلوک کیا جاتا ہے اور ان کی جس طرح مٹی پلید ہوتی ہے وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ غالباً اسی لیے آہستہ آہستہ سنجیدہ شاعر مشاعروں سے جدا ہوتے جا رہے ہیں۔ دو چار اگر رہ گئے ہیں تو محض اس لیے کہ شاید ان کی کچھ مجبوریاں ہوں۔

جو لوگ اردو زبان کو سمجھتے ہیں لیکن اس کے رسم خط سے واقف نہیں وہ اردو شاعری کے بارے میں انھیں مشاعروں سے رائے قائم کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اردو میں بہت پوچ اور ادنیٰ قسم

مراسلات

کچھ "ہماری زبان" کے سلسلے میں

ہماری زبان کی حالیہ اشاعتوں میں 'میرا صفحہ' کے عنوان سے ایک نئے سلسلے کا آغاز اور 'رفتار' کا احیاء دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس اقدام نے ان لوگوں کو بھی مداح بنا دیا ہوگا جو کسی نہ کسی وجہ سے انجمن ترقی اردو کے اس ترجمان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرزمین علی گڑھ سے نکلنے اور سرور صاحب کی ادارت دونوں کا تقاضا تھا کہ 'ہماری زبان' عصر حاضر کے مسائل سے چشم پوشی نہ کرے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر حقیقت پسندانہ انداز سے ان کا جائزہ لے کر قارئین کی رہنمائی کرے۔ زندگی کے کسی بھی مسئلے کو شتر ماضی کے تصورات کی ریت میں منہ چھپا کر تو حل نہیں کیا جا سکتا۔ آج سے کم و بیش نصف صدی قبل اگر سرسید اور ان کے رفقائے کار مصلحتوں اور روایتوں کی بیڑیاں پہنا دیتے تو تہذیبی، سماجی اور سیاسی ترقیوں سے قطع نظر، اردو زبان و ادب کا شجر بھی اتنا تناور اور سایہ دار نہ ہوتا اور نہ ہی ماضی قریب میں وقت کے تقاضوں کے تحت کچھ نئی شاخیں نکل پاتیں۔ آج جب کہ پھر کچھ نئی شاخیں نکل رہی ہیں، نت نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ کھلی آنکھوں سے ان کا جائزہ لینا ضروری ہی تھا۔

مندرجہ بالا عنوانات کے تحت تحریروں میں ایک بات خوشی سے زیادہ اطمینان کی یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ ان کا انداز مولوی صاحب یا پولیس والے کا سا نہیں بلکہ ہمدردانہ اور افہام و تفہیم کا ہے اور یہی چیز ان تحریروں کو انفرادیت بخشنے کے علاوہ توجہ کے قابل بھی بناتی ہے۔

سرور صاحب کا 'میرا صفحہ' دراصل بڑی خوشگوار تبدیلیوں کا مظہر ہے۔ ان کا نئی کتابوں، رسائل اور مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ و تجزیہ، اور پھر صاف ستھری، خوبصورت نثر اور جچا تلا دلنشیں انداز۔ بس "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" والی بات یاد آجاتی ہے۔ تازہ شمارے میں بعض نسبتاً پرانے اور سبھی قابل ذکر نئے رسالوں کا جس انداز سے تعارف کرایا گیا ہے ان کی خوبیوں اور خامیوں پر جس سلیقے سے روشنی ڈالی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کو سادگی و پرکاری اور دیانت اور خلوص کا بہت اچھا مرقع کہا جا سکتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ چند ٹکڑے یا کچھ جملے یہاں نقل کردوں مگر محسوس ہوا کہ تقریباً پورا مضمون ہی لکھنا پڑے گا اور یہ مراسلہ بہرحال اس طوالت کا متحمل نہ ہوگا۔

'رفتار' کا احیاء بھی قابل مبارکباد اقدام ہے۔ دراصل عصری ادب اور اس کے مسائل پر خلیل الرحمن اعظمی کی نگاہ بہت اچھی ہے اور APPROACH ہر طرح کے افراط و تفریط سے پاک۔ یکم جنوری کے شمارے میں اس عنوان کے تحت ان کا فکر انگیز مضمون بہتوں کو کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرے گا۔ ان کی اس بات میں کتنی صداقت ہے:

"ادب میں عصری تقاضوں اور اس سے پیدا شدہ تبدیلیوں کے عمل کو نہ پہلے کوئی روک سکا ہے اور نہ اب روک سکتا ہے۔ طرز احساس، ذہنی رویہ اور اسلوب اظہار کا جامد اور ساکن ہو جانا تو تشویشناک ہو سکتا ہے ان کی تبدیلی اور شکست و ریخت سے اس قدر خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری زبان میں اس سے پہلے بھی شاعری کی دو منزلیں آ چکی ہیں جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں..."

نئی شاعری کے بارے میں عام طور سے ہمارے "بزرگوں" کا جو رویہ ہے اس کے بارے میں بھی ان کا یہ کہنا بھی کتنا برمحل ہے:

"...نئی شاعری سے متعلق گفتگو عام طور پر عمومی اور مبہم ہوتی ہے... ہم تعریف بھی کرنے سے جھجکتے ہیں اور اعتراض کرتے ہوئے بھی ان لوگوں کے نام لینے سے گریز کرتے ہیں جن پر اعتراض کیا جا رہا ہے..."

خلیل صاحب کے اٹھائے ہوئے ۱۷-۱۸ سوالات بھی ہر صاحب شعور اور بالغ نظر شخص کے لیے لمحۂ فکریہ ثابت ہوں گے۔ ضرورت ہے کہ ان سوالات کی روشنی میں نئی شاعری کا سنجیدگی سے اور تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور بجائے عمومی انداز میں بات کرنے کے واضح اور قطعی قسم کی گفتگو کی جائے۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ خلیل صاحب خود بعض مسائل پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح دوسرے قارئین بھی ان مضامین کا بے چینی سے انتظار کریں گے۔

براہ کرم ان سلسلوں کو جاری رکھیے۔ بہتوں کا بھلا ہوگا۔

آخر میں ایک بات "انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات" کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

چند سال قبل READERS DIGEST کے ایک "MY HUSBEND - HENRY BOOK-SUPPLIMENT" کا ترجمہ کرتے وقت میں نے HONEY MOON HERO کا ترجمہ "ماہ شیریں" کیا تھا۔ اشاعت کے بعد کئی لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا تھا۔ اب اہل نظر کی جو رائے ہو۔

RESURRECTION کو میرے خیال میں اصطلاحاً قیامت، نشور، یوم حشر ہی کہیں گے۔ بہت کچھ انحصار محل استعمال پر ہوگا۔ احیاء عام طور سے REVIVAL کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور تجدید عموماً RENEWAL کے معنوں میں۔ ویسے محل استعمال کی بات یہاں بھی پیش نظر رہے گی۔

(ابرار اعظمی)

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں

مجھے گمان تھا لفظی تحقیق کا خبط صرف آغا خلش کاشمیری تک محدود ہے لیکن ۱۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کے شمارہ "ہماری زبان" میں کسی "اختر انصاری صاحب" کو بھی مجبور دیکھ کر "خوب گزرے گی" والی مثل صادق آگئی۔ میں اختر صاحب انصاری کے حدود اربعہ سے آگاہ نہیں ہوں اس لئے ان کے مبلغ علم یا زبان دانی پر حرف رکھنا پسند نہیں کرتا۔ میں ایک سے زیادہ بار کہہ چکا ہوں کہ اردو میری اکتسابی زبان ہے میں دیوانگی کی حد تک اس کا گرویدہ ہوں۔ مجھے اس ضمن میں جو اچھی بات مل جاتی ہے گرہ میں باندھ لیتا ہوں۔ اختر صاحب انصاری نے جہاں میری ہم نوائی کا شرف بخشا ہے وہاں میری عبارت میں کیڑے ڈالنے کی بھی سعادت حاصل کی ہے۔ اختر صاحب انصاری نے معرکہ آرائی کے لیے ہماری زبان کے صفحات کا سہارا لے کر اپنے لیے اچھا میدان تیار نہیں کیا۔ "ہماری زبان" کے قارئین میں باذوق ہی نہیں فن آشنا لوگ بھی ہیں۔ مجھے ہدفِ سہامِ ملامت بنانے میں تعجیل سے کام لے کر اختر صاحب انصاری نے "اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال" کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اختر صاحب انصاری نے ایک پتے کی بات یہ بھی کہی ہے "میرے خیال میں تحریر کا یہ انداز موجودہ دور میں ہندی کے اثر سے اردو میں داخل ہوا ہے" ع "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا" اختر صاحب انصاری پر شاید یہ حقیقت آشکارا نہیں کہ اردو زبان ہندستان کی پیداوار ہے ایران یا عرب کی نہیں ہے جس "ہندی" پر حرف رکھا گیا ہے وہ خود اردو زبان کا لفظ ہے اور اردو ترکیب کا مرہونِ احسان ہے۔ اردو کی اساس ہندستانی بھاشاؤں پر ہے اس لیے اس پر ہندی کے اثر کا اعتراض صرف ہوائی ہے۔

اختر صاحب انصاری نے میری عبارت پر درجن اعتراضات جڑ دیے ہیں اور ہر بار کسی دلیل کے بغیر یہ تحریر کر دیا ہے "کر لیں" چاہیے تھا۔ اگر اختر صاحب انصاری کے فرمودات وزنی ہوتے تو بحیثیت طالب علم بھی میرا فرض تھا کہ "خذ ما صفا دع ما کدر" کی روشنی میں اختر صاحب انصاری سے استفادہ کرتا لیکن بادِ ہوا اعتراضات پر ایمان لانا میرے بس سے باہر کی بات ہے۔ میں اختر صاحب انصاری کے اعتراضات کو بصورت مکالمہ رکھتا ہوں کہ قارئین ہماری زبان پر "قصہ تھا جنا" کی اصلیت واضح ہو جائے۔ میں اپنے جملے کو خلش اور اختر صاحب انصاری کے اعتراض کو اختر سے منسوب کرتا ہوں۔

(۱) خلش: "کشمیر کانفرنس میں پڑھا گیا مضمون"۔ اختر: "کشمیر کانفرنس میں پڑھا جانے والا مضمون یا وہ مضمون جو کشمیر کانفرنس میں پڑھا گیا" لکھنا چاہیے تھا۔ جواب: "خلق الانسان" ترجمہ پیدا کیا گیا انسان۔ (۲) خلش: "میں سو فی صد اتفاق نہ کر سکا"۔ اختر: صحیح روزمرہ سو فی صدی ہے۔ جواب: صدی یعنی سنچری ہے CENT PERCENT سے مراد صد فی صد ہے۔

(۳) خلش: "اتفاق نہ کر سکا"۔ اختر: "اتفاق نہیں کر سکا"۔ جواب: نہیں ہندی بھاشا کا شبد ہے۔ اختر صاحب اپنے ہی نظریے سے انحراف کر رہے ہیں۔ (۴) خلش: "میری نانی مرحومہ اکثر کشمیری زبان میں گفتگو کرتی تھی"۔ اختر: یہاں کوئی غلطی نہیں ہے لیکن مروجہ آداب کی رو سے نانی مرحومہ کے لیے "گفتگو کرتی تھیں" استعمال ہونا چاہیے۔ جواب: مجھے تسلیم ہے اور اختر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (۵) خلش: "میری والدہ اردو زبان کی ٹانگ توڑنے کی ناکام کوشش کرتی تھیں"۔ اختر: اگر غور سے کام لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ناکام کا لفظ نہ صرف غیر ضروری بلکہ مخلِ فصاحت ہے۔ جواب: اختر صاحب پر واضح ہو کہ ناکام بمعنی بے مراد ہے۔ (۶) خلش: "میرے والد گھر پر پنجابی زبان میں معاملت کرتے تھے"۔ اختر: اردو میں معاملت کا لفظ اپنے اصلی و لغوی معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی کسی کے ساتھ مل کر کوئی کام کرنا۔ اس کو گفتگو کے معنی میں استعمال کرنا محض زبردستی یا غیر ضروری جدت۔ جواب: جہاں گھر اور والد کا تذکرہ ہے وہاں گفتگو نہیں معاملہ کا محل ہے۔ گھریلو زندگی کا انحصار عمل پر گفتگو سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ (۷) خلش: "فردوس میں کشمیری گھرانے"۔ اختر: "فردوس میں رہنے والے کشمیری گھرانے" لکھنا چاہیے تھا۔ جواب: فردوس بمعنی ہمسائیگی ہے۔ (۸) خلش: "رگِ غیرت کو جھنجھوڑتے ہیں"۔ اختر: جذبۂ غیرت کو جھنجھوڑا جاتا ہے رگِ غیرت کو نہیں۔ جواب: جھنجھوڑنا بمعنی کسی کو پکڑ کر ہلانا ہے اختر صاحب انصاری کے جذبہ کو کس کے ہاتھ اور کون سے ہاتھ پکڑتے ہیں۔ (۹) خلش: "القدس باقی ہوں"۔ اختر: یہاں اس کہاوت کا محل نہیں تھا۔ جواب: تھا۔ (۱۰) خلش: "حسین پورہ میں بود و باش"۔ اختر: حسین پورہ کی بود و باش۔ جواب: حسین پورہ کی نہیں آغا خلش کاشمیری کی بود و باش تھی اور حسین پورہ میں تھی۔ (۱۱) خلش: "کاتب الحروف"۔ اختر: راقم الحروف۔ جواب: کاتبِ تقدیر کو راقمِ تقدیر نہیں کہتے۔ رقم رقوم کی واحد بھی ہے جبکہ کتب صرف لکھنے کا مفہوم دیتا ہے۔ (۱۲) خلش: "اپنی فوقیت جتانے کی بڑ ہانکے"۔ اختر: اپنی فوقیت جتائے اور بے وجہ بڑ ہانکے۔ جواب: بڑ ہانکنا بمعنی بے تکی باتیں کرنا ہے۔ (۱۳) خلش: "بھلا معلوم نہیں دیتا"۔ اختر: بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ جواب: کیوں؟ (۱۴) خلش: "جہاں تک میرے علم کا علاقہ ہے"۔ اختر: یہاں لفظ علاقہ اس طرح استعمال ہوا ہے جس طرح تعلقے دار یا تحصیلدار کے علاقے کے ذکر میں استعمال ہوتا ہے۔ جواب: علق سے ہے بمعنی تعلق ہے اور علاقہ بمعنی تعلق ہے اور اسی طرح سے بے سروپا اعتراض اختر صاحب انصاری نے کیے ہیں جن کے لیے ہماری زبان کے قیمتی صفحات کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا اگر تفصیل سے جواب درکار ہوں تو اختر صاحب انصاری مجھے اپنے ایڈریس سے باخبر کر دیں۔ انشاء اللہ شافی جوابات روانۂ خدمت کروں گا۔ "ہماری زبان" میں اپنے آپ کو اسموک کر دینا میں انجام کار

میرے استعمال کئے گئے الفاظ طمانیت اور صدی کو مورد عتاب بنایا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے صدی کو صدیٰ لکھا گیا ہے جو اگر غلط الکاتب نہیں تو سنگین غلطی ہے (اختر انصاری)

جواب:- میں خود ہمیشہ طمانیت لکھتا ہوں سہو کتابت سے خوش نویس نے طمانیت لکھ دیا ہے جس پر میں نے اس پرچے کی سادہ لوحی کہ جہاں فصول اکبری منتخب اور مزیل میں طمانیت بے نون ہے وہاں صراح میں ایک نون حذف کر کے بھی موجود ہے۔ لیکن جہاں تک صدی کا تعلق ہے صاحب غیاث نے تحریر کیا ہے۔

صدی: بضم اول و فتح دال مہملہ و بعدہٗ الف بصورت یا، سرودے کہ در جواب شتربانان می سرایند و شتر بداں مست شدہ چالاک می گردد (از مدار، منتخب، صراح)

حدا: بضم اول بمعنی راندن شتر بنغمہ

کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ اختر صاحب انصاری کو فارسی عبارت کا ترجمہ کر کے سمجھایا جائے۔ (آغا خلش کاشمیری)

بقیہ صفحہ ۶ سے آگے

کی شاعری ہو رہی ہے اور شاید اس کے ادب کی حفاظت الحفاظ کے دور سے گزر رہی ہیں۔ ان کی اس رائے کو ہم کیسے غلط کہیں جب کہ مشاعروں کے ذریعہ اردو شاعری کے جو نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں وہ قطعاً اس شاعری سے مختلف ہیں جو کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے لیکن کتابوں اور رسالوں کی سرپرستی کے بجائے کیوں ہم مشاعروں کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں اور کس لیے قوم و ملک کا لاکھوں روپیہ ہر سال ایسے شعراء پر صرف کیا جاتا ہے جو اردو شاعری اور اردو زبان کو بھی بھر کر رسوا کر رہے ہیں ان مسائل پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

انیس انور

مکتوب لندن

نائب مدیر مشرق افضل حق انتقال کر گئے

جناب افضل حق نائب مدیر مشرق ایک طویل علالت کے بعد گزشتہ ہفتے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ گزشتہ دو سال سے لندن کے ہاورے اسپتال اور لندن یونیورسٹی کے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ انھیں آنتوں کا مرض تھا جس کی وجہ سے غذا ہضم نہ ہوتی تھی اور جسم میں خون دن بدن کم ہو رہا تھا۔ لندن یونیورسٹی اسپتال میں ان کے پیٹ کا آپریشن بھی کیا گیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ گزشتہ ماہ انھیں تبدیلِ آب و ہوا کے لیے لاہور بھیج دیا گیا تھا اور یہی سفر سفرِ آخری ثابت ہوا۔ افضل حق مرحوم گزشتہ چار برس سے ادارہ مشرق سے منسلک تھے اور مشرق کی تعمیر و ترقی میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔

آسٹن یونیورسٹی میں ادبی و تفریحی تقریب

آسٹن یونیورسٹی کے بڑے ہال میں برٹش کونسل اور انجمن طلبہ کی جانب سے ایک مشترکہ ادبی و تفریحی تقریب کا اہتمام گزشتہ ہفتہ کیا گیا۔ حاضرین میں بھارت اور پاکستان کے شہریوں کے علاوہ انگریزوں نے بھی خاصی تعداد میں شرکت کی۔ مسٹر پیٹر جیکسن، ڈپٹی تھیٹر ... برمنگھم مہمان خصوصی تھے۔ مسٹر جیکسن نے اپنی تقریر میں اس تقریب کو سراہتے ہوئے بھارتی و پاکستانی تارکین وطن پر زور دیا کہ وہ انگریزوں کو اپنے مذہب، ادب، تہذیب اور طرز معاشرت سے شناسا کرتے رہیں۔ اس سلسلہ میں بعض نے قرآن کریم اور بھگوت گیتا سے چند اقتباسات انگریزی میں پڑھ کر سنائے جسے حاضرین نے کافی سراہا۔ اس کے بعد مختلف فنکاروں نے اردو و بنگالی گیت اور رقص پیش کئے۔ مسٹر روشن الدین کی ایک اردو غزل اور ایک بنگالی فنکارہ کے گیت کی دھن کو انگریز حاضرین نے خاص طور سے پسند کیا۔

عبداللہ ملک کا عزم کیوبا

لندن میں مقیم ایک اردو و انگریزی صحافی عبداللہ ملک کیوبا کی کلچرل کانگریس کی دعوت پر کیوبا جا رہے ہیں تاکہ ہوانا میں شروع ہونے والی انٹرنیشنل کلچرل کانگریس کی سالانہ تقریبات میں شرکت کر سکیں۔ توقع ہے کہ مشہور اردو شاعر فیض احمد فیض بھی ان تقریبات میں شامل ہوں گے۔

انتخاب مشرق: لندن کی عید از فرخ

عید ہر زندگی ہے آرزوؤں کی بہار
عید حسن دلکشا کی مست آنکھوں کا خمار
عید دل کی ان کہی ہر آرزو کا ماحصل
عید تیرے لالہ گوں ہونٹوں کا مستانہ نکھار
عید میں تیرے تصور کا حسیں دربار ہے
عید لندن میں تمہاری یاد سے سرشار ہے

مشورہ از شاکر دھیانوی، نیوکاسل

یہ بھی سچ ہے!
وہ بھی سچ ہے!
سب کچھ سچ ہے مان لو!
لیکن تم کو ایسی نفرت والی [illegible]
میں نے بھی [illegible]

ریاستی شاخ آندھرا پردیش کے سالانہ اجتماع کی اہم قراردادیں

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کے سالانہ اجتماع میں حسب ذیل قراردادیں پاس کی گئیں۔

قرارداد نمبر ۱

ریاست آندھرا پردیش کے سرکاری زبان کے قانون میں اردو کے غیر اطمینان بخش موقف پر توجہ دلانے اور قانونی ضمانت کے ذریعہ اس کی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے مطالبہ کو پیش کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا ایک وفد ستمبر میں چیف منسٹر سے ملا تھا اور ایک یادداشت ان کے حوالہ کی تھی لیکن افسوس ہے کہ یقین دہانی کے باوجود اس سلسلے میں حکومت نے کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ انجمن کے کارکنوں کا یہ اجتماع حکومت کے اس رویہ پر تشویش کا اظہار کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ سرکاری زبان کے قانون کی دفعہ (۲) سے سیکنڈ کے الفاظ حذف کر کے اردو زبان کے مستقبل کی ضمانت دے اور اپنے وعدوں کے مطابق ایک اعلامیے کے ذریعہ آندھرا پردیش میں اردو کے موقف، اس کے دائرہ عمل اور اس کے استعمال و اختیار کی وضاحت کرے۔

یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کے حسب ذیل مطالبات کو تسلیم کر کے اس تشویش اور بے اطمینانی کو دور کرنے کی کوشش کرے جو اپنی زبان کے مستقبل کے تعلق سے پیدا ہوگئی ہے۔

۱۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ آندھرا پردیش میں بسنے والوں کی ایک بھاری تعداد اردو بولتی ہے اردو آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کی مادری زبان ہے، اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔

۲۔ تمام صوبجات، قصبات اور شہروں میں جہاں آبادی کا کم از کم دس فیصد حصہ اردو بولتا ہے حسب ذیل سہولتیں فراہم کی جائیں۔

(الف) اہم قوانین، قاعدے، ضابطے اور اعلامئے، سرکولر، فہرست رائے دہندگان، بجلی اور آب رسانی کے بل، راشن کارڈ وغیرہ اردو میں بھی جاری کیے جائیں۔

(ب) وکلا کو عدالتوں میں اردو کے استعمال کی اجازت ہو اور عرضی دعوے، درخواستیں، مرافعے، حلف نامے وغیرہ اردو میں بھی قبول کیے جائیں اگر فریقین فیصلے اور احکام کے اردو ترجموں کا مطالبہ کریں تو انہیں مہیا کیے جائیں۔

(ج) ضلع پریشدوں، پنچایت سمیتیوں اور دوسرے بلدی باڈیز میں اس کا انتظام کیا جائے کہ اگر کوئی رکن اردو میں تقریر کرے تو اس کارروائی کا ریکارڈ اردو میں بھی رکھا جائے۔

(د) متعلقہ ضلع کے دفتروں میں اردو بولنے والے اہل معاملہ کے لیے پوری طرح سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(ھ) تمام سرکاری عمارتوں کے سائن بورڈ اردو میں بھی لکھے جائیں۔

۳۔ داخلے کے سرٹیفکیٹ پر [illegible] کی موجودگی پر اصرار کیے بغیر بعض صورتوں میں [illegible] اردو ذریعہ تعلیم

مدارس میں اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کا انتظام کیا جائے اور اساتذہ کی ٹریننگ اور نصابی کتابوں کی طباعت کا بھی انتظام کیا جائے۔

۴۔ مختلف سرکاری ملازمتوں میں تقرر کے اغراض کے لیے اردو کا بھی استعمال کیا جائے۔

۵۔ ایوان مقننہ میں پیش ہونے والے مسودہ قانون منظور کردہ قوانین اور گورنر کے آرڈیننس کے لیے اردو بھی استعمال کی جائے۔ ریاستی سرکار کی طرف سے جاری ہونے والے تمام احکام، قوانین، ضابطے اور ذیلی قوانین وغیرہ اردو میں بھی ہوں۔ مقننہ کے اراکین کو اردو میں تقریر اور سوالات کرنے کی آزادی حاصل ہے اور ان کے جوابات بھی اردو میں دئے جائیں۔ مقننہ کی کارروائی کی روداد میں اور حکومت کے گزٹ اردو میں بھی شائع ہوں۔

انجمن کے کارکنوں کا یہ اجتماع ان مطالبات کی تشہیر اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے طے کرتا ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں آندھرا پردیش میں ہفتۂ اردو منایا جائے۔

قرارداد نمبر ۲

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش اردو تعلیم کے مسائل سے حکومت اور محکمہ تعلیم کو وقتاً فوقتاً واقف کراتی اور ان دشواریوں کو دور کرنے کا مطالبہ کرتی رہی ہے جن کی وجہ سے اردو بولنے والوں پر تعلیم کے دروازے بند ہوتے جا رہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ حکومت اور محکمۂ تعلیم نے بنیادی مسائل کو حل کرنے اور واجبی شکایات کے سدباب کی طرف ضروری کوشش نہیں کی بلکہ ٹال مٹول کی پالیسی سے کام لیتی رہی ہے۔

انجمن کے کارکنوں کا یہ اجتماع حکومت اور محکمۂ تعلیم کے اس رویے پر سخت احتجاج کرتا ہے اور پھر ایک بار اپنے مطالبات کو دہراتے ہوئے ان کے عاجلانہ تصفیہ پر زور دیتا ہے۔

(الف) اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کے لیے جگہ مہیا کرنے اور غیر متوالی اخراجات کی پابجائی اور عطیات کی شرط فوراً برخواست کی جائے۔ اردو والے بعض مخصوص اسباب کی وجہ سے انتہائی معاشی پستی کا شکار ہیں اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ متذکرہ بالا شرائط کی تکمیل کریں گے بہت ہی گمراہ کن ہے۔

محکمۂ تعلیم نے اپنے مراسلے نمبر مورخہ کے ذریعہ جو وضاحت کی ہے وہ سراسر غیر تشفی بخش ہے اگر لوکل باڈیز غیر متوالی اخراجات برداشت کرنے کے موقف میں نہیں ہیں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ یا تو ان اداروں کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے عملی اقدام کرے یا لسانی اقلیت کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کی مالی ذمہ داری براہ راست خود قبول کرے۔ یہ جلسہ متذکرہ شرائط کو لسانی اقلیت کے بنیادی حقوق اور دستوری تحفظات کے منافی تصور کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ان کو فوراً برخواست کر دیا جائے۔

(ب) اردو تعلیم کے مسائل کچھ اس طرح الجھ گئے ہیں اور شکایتوں کی نوعیت اور ان کی تعداد کچھ اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ان کے حقیقت پسندانہ جائزے بروقت اور مناسب تصفیہ کے لیے ایک اسپیشل افسر کا تقرر

ناگزیر ہوگیا ہے جو مختلف مقامات کا دورہ کرکے اردو تعلیم کی حقیقی مشکلات اور اردو دانوں کی ضروریات سے محکمہ کو باخبر رکھے اور واجبی شکایتوں کو رفع کرنے کا فوری بندوبست کرے گے۔ اس لیے یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ناظم تعلیمات کے تحت ایک اوسپیل افسر کے تقرر کے فوری احکام جاری کرے۔ عمومی نوعیت کے اسپیشل افسروں کی جائدادوں کی بحالی کے سوال کو اردو اسپیشل افسر کے تقرر کے مسئلہ سے جوڑ کر اصل مطالبہ کو پس پشت ڈالنے کی کوشش پر یہ جلسہ احتجاج کرتا ہے اور حکومت اور محکمہ پر زور دیتا ہے کہ ہمارے مطالبہ پر خصوصی توجہ دے۔

(ج) اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کے معائنہ کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے معیار تعلیم برابر گرتا جا رہا ہے۔ شمالی سرکار اور رائل سیما میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول مقرر ہیں لیکن ان کی تعداد ناکافی اور ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے فرائض کما حقہ پورے نہیں کر سکتے اس لیے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کی تعداد میں اضافہ کرے اور ہر ڈپٹی انسپکٹر کے تحت پچاس سے زائد اسکول نہ رکھے جائیں۔ شمالی سرکار اور رائل سیما کے برخلاف اردو مدارس کے معائنہ کے لیے تلنگانہ میں ڈپٹی انسپکٹروں کا کوئی انتظام نہیں ہے جس کی وجہ سے یہاں کے مدارس کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی ہے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ شمالی سرکار اور رائل سیما کے خطوط پر تلنگانہ میں بھی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے مقرر کیے جائیں۔

(د) اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس میں تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی سے تعلیم کا معیار بری طرح گرتا جا رہا ہے اس لیے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ حیدرآباد کے علاوہ ان اضلاع کے متقردوں کے ٹریننگ اسکولوں میں اردو اساتذہ کی ٹریننگ کے متوازی انتظام کیا جائے جہاں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس موجود ہیں۔

(ہ) ملٹی پرپز ہائر سکنڈری اسکولوں میں اردو کی تدریس کے لیے بالعموم جن اساتذہ کو مقرر کیا جاتا ہے وہ ضروری قابلیت کے حامل نہیں ہوتے جس کی وجہ سے اردو کی تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح دوسرے مضامین کے لیے پوسٹ گریجویٹ اساتذہ مقرر کیے جاتے ہیں اسی طرح اردو کے لیے بھی صرف پوسٹ گریجویٹ اساتذہ ہی کا تقرر کیا جائے۔

(و) نصابی کتب کے معیار اور ان کی فراہمی کے مسائل کے پیش نظر یہ جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ اردو کی تمام نصابی کتابوں کو مہیا کیا جائے اور محکمہ تعلیم معیاری نقشوں اور اٹلس کی تیاری اور فراہمی کا بھی انتظام کرے۔

قرارداد نمبر ۳۔ آغاز سال تعلیمی ۱۹۶۸ء سے آندھرا پردیش کی یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی کی بجائے یہاں کی علاقائی زبان تلگو قرار دی جائے گی۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں اور ہمدردوں کا یہ اجتماع اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ساتھ ہی یہاں کی دوسری علاقائی زبان اردو ذریعہ تعلیم کے کالج بھی حسب ضرورت حکومت اور یونیورسٹی کے تحت قائم کیے جائیں۔

قرارداد نمبر ۴۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا یہ اجتماع شری وائس چانسلر یونیورسٹی سے پھر ایک بار مطالبہ کرتا ہے کہ اورینٹل لینگویجز کے امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ اور طالبات کے لیے انٹرنس کے امتحان کے انعقاد کا فوری انتظام کرے۔

قرارداد نمبر ۵۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا یہ اجتماع شری وائس چانسلر یونیورسٹی سے پھر ایک بار مطالبہ کرتا ہے کہ وہ میٹریکولیشن کا امتحان اردو میڈیم میں بھی منعقد کرنے کا فوری انتظام کرے تاکہ وہ طلبہ اور طالبات جو اردو کے ذریعہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے خواہشمند ہوں دوسری یونیورسٹیوں کے امتحان میں شرکت کرنے کی زحمت بے جا سے بچ سکیں۔

باقی صفحہ ۲ سے آگے

سے پہلے ریاض کیا جائے ورنہ زمین میں رفتہ رفتہ لالہ و گل کے بجائے گر کر گھاس آگے گی۔

چھٹی بات یہ ہے کہ طلبہ کی زندگی ایک مصروف زندگی ہونی چاہیے اپنے درسی فرائض کے علاوہ شوق کے کاموں کی بھی مصروفیت جس سے شخصیت میں رنگینی پیدا ہوتی ہے اور جمالیاتی، اخلاقی اور سماجی شعور بڑھتا ہے۔ اس طرح اساتذہ کے یہاں بھی علمی کاموں میں عبادت کا انداز ہونا چاہیے اور اس عبادت میں فراغت اور راحت کا احساس ہونا چاہیے۔

آخری بات یہ ہے کہ یونیورسٹی میں صرف دو جز اہم ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ۔ اساتذہ ہی یونیورسٹیوں کی بہتر قیادت کر سکتے ہیں اور طلبہ کی مناسب نگرانی۔ یونیورسٹیوں کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ غریب کی بجائی بن کر رہ گئی ہیں۔ حکومت یا سیاسی پارٹیاں سب اپنی اپنی چودھراہٹ چاہتی ہیں۔ یونیورسٹیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں پوری آزادی ہونی چاہیے۔ ان کے چلانے والے دیکھ بھال کر مقرر کرنے چاہئیں اور انھیں مناسب وسائل مہیا کرنے چاہئیں۔ پھر انھیں دکھاوے کے کاموں یا شعبدہ بازی میں نہیں الجھانا چاہیے بلکہ خاموشی سے کام کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ سب سے اچھا راستہ ہمیشہ دور کا راستہ ہوتا ہے۔

آج ملک میں صرف اقتصادی مشکلات ہی نہیں ہیں۔ اچھی قدروں کی پامالی نے بھی ہماری مشکلات بڑھا دی ہیں۔ جیسے نہ تو کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں، نہ کسی چیز پر اعتبار ہے۔ اچھی قدروں کی اشاعت اور زندگی کی اور سماج کی ذہنی قیادت یونیورسٹیاں کر سکتی ہیں، بشرطیکہ ان کی عنان ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو آشنائے راز ہیں جن کے دل کو لگی ہے جو راج ہٹ اور بال ہٹ دونوں کو سمجھتے ہیں اور دونوں سے بچ کر علم و آگہی کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

میرا صفحہ

ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں کیا خرابی ہے؟ وہ اپنا فرض کیوں پورا نہیں کر رہی ہیں۔ وہ دانش کدے کیوں نہیں۔ ان سے انسان کیوں نہیں نکلتے، چیخنے چلانے والے ہجوم کیوں برآمد ہوتے ہیں۔ ان میں آگہی کی روشنی اور تہذیب کی جگمگاہٹ کیوں نہیں، ایک بے معنی ہیجان، ایک تشنجی کیفیت کیوں ملتی ہے ان میں لوگ ہر چیز کے خلاف کیوں ہیں، کسی چیز کے موافق کیوں نہیں۔ یہاں ہر چیز سے نفرت کیوں ملتی ہے محبت کیوں نہیں ملتی۔

اس سوال کے بہت سے جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک سیاست داں سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ ساری یونی ورسٹیاں اس کے سیاسی پروگرام پر چلنے لگیں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک سرکاری افسر سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ ان لوگوں کو آزادی بہت دی گئی ہے، کچھ سختی کی ضرورت ہے۔ ایک ادھیڑ طالب علم سے پوچھئے تو وہ جواب دے گا کہ اسے جب تک روزگار نہ ملے ان یونیورسٹیوں کا کیا جواز ہے۔ ایک پرانے استاد سے پوچھئے تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گا کہ ہماری جوانی کے زمانے میں حالات بہت اچھے تھے۔ اب نہ وہ طالب علم نہ وہ استاد۔ ایک نئے استاد سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ صاحب مجھے اونچے زینے پر چڑھنا ہے، مجھے ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ صرف یونی ورسٹیوں ہی میں خرابی نہیں ہے پورے ملک میں اور سماج میں بہت سی خرابیاں ہیں اور ان کا اثر یونیورسٹیوں میں بھی محسوس ہو رہا ہے۔ مگر چونکہ یونیورسٹیوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ صرف ملک اور سماج کی خرابیوں کو ہی قبول نہ کریں گی، بلکہ اس ملک اور سماج میں جو اچھائیاں ہیں انھیں بھی اجاگر کریں گی اور اپنی قدروں کے ذریعہ سے ملک اور سماج کی برائیوں کو کچھ کم کرنے کی کوشش بھی کریں گی، اس لیے صرف ملک اور سماج کو الزام دینے سے کام نہ چلے گا، یونیورسٹیوں کی اپنی کوتاہیوں پر بھی نظر ڈالنا پڑے گی۔

پہلی بات یہ ہے کہ یونی ورسٹیاں، اپنے اساتذہ کے اور اپنے طلبہ کے انتخاب میں ضروری احتیاط سے کام نہیں لے رہی ہیں۔ ملک اور سماج کا یہ فرض ہے کہ ہر شہری کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم دے لیکن ملک اور سماج کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اسے یونی ورسٹی کی تعلیم بھی دلائے۔ یونیورسٹی کی تعلیم انھیں کے لیے ہے جو اس کے لیے اپنی صلاحیت کا ثبوت دے سکیں۔ اس طرح یونی ورسٹی کے اساتذہ بھی ایسے ہونے چاہئیں جو اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ جسے کاروبار نے ٹھکرا دیا یا جو سرکاری ملازمت حاصل نہ کر سکا وہ کسی نہ کسی طرح یونی ورسٹی میں آ گیا اور یونی ورسٹی کے اساتذہ کو پھر ایسا مشاہرہ ملنا چاہئے جو سرکاری ملازموں اور اچھے کاروباری اداروں سے کسی طرح کم نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم کا وہ طریقہ جس میں آخری امتحان سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جلد سے جلد بدل دینا چاہئے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ تدریس کا طریقہ بدل دیا جائے یا نصاب میں کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا یہ سطحی بات ہے۔ اصل چیز امتحان کا طریقہ ہے طلبہ کی کامیابی اور تحریری کام اور ان کے زبانی امتحان پر ہونا چاہئے نہ کہ سال بھر کے بعد تین گھنٹے کے پرچے میں سے کورس کے ایک حصے پر کچھ رٹے ہوئے موضوعات پر مضامین لکھنے پر۔ یہ امتحان انھیں اساتذہ کو لینا چاہئے جو طلبہ کو پڑھاتے ہوں، ہاں ان اساتذہ کی ایمانداری، غیر جانبداری اور دیانت داری مسلّم ہونی چاہئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت ان کی علمی صلاحیت کے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ استاد ہونے کی کس حد تک صلاحیت رکھتے ہیں۔ استاد ہونے کی صلاحیت کی پہچان یہ ہے کہ وہ تدریس کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے لیے کتنی تیاری کر سکتے ہیں۔ ان کا ذہن کس قدر کشادہ ہے۔ وہ نوجوانوں پر اپنی شخصیت کا کیا اثر ڈال سکتے ہیں۔ ان کے پاس قدریں کیسی ہیں۔ وہ اپنی ذات کے خول میں بند تو نہیں ہیں۔ وہ یونیورسٹی کی جگہ کو صرف اپنی ذاتی ترقی کا زینہ تو نہیں سمجھتے ہیں۔ انھیں علوم، ادبیات، تہذیبی سرگرمیوں، سیاسی اور سماجی میلانات سے کتنی دلچسپی اور کتنی واقفیت ہے۔ وہ عمومی نظر کے علاوہ کسی مخصوص دائرے میں گہری نظر رکھتے ہیں یا نہیں ان میں رہنمائی کی، رفاقت کی، مل کر کچھ کرنے کی امنگ ہے یا نہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یونی ورسٹیوں کی تعلیم مادری یا علاقائی زبان میں ہونی چاہئے، مگر انگریزی کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانا چاہئے اور اس کے ایک اچھے معیار پر اصرار کرنا چاہئے۔ یونی ورسٹیوں میں معلومات تو سیرونی زبانوں میں بھی دی جا سکتی ہیں، اگر علم دینا ہے تو اپنی زبان میں دینا پڑے گا۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کا مقصد معلومات کا بوجھ لادنا نہیں ہے۔ ذہن کو بیدار کرنا ہے، تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرنا ہے۔ خود سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ طالب علم کو اس راستے پر لیجانا ہے جو اس کی فطرت کے مطابق ہے ایسا ذہن غیر زبانوں کے ذریعہ سے نہیں پیدا ہوگا۔ ہاں انگریزی جیسی زبانوں کا علم اس ذہن کو کشادہ رکھے گا، اسے سکڑنے نہ دے گا۔ کاش یہ صاف اور سیدھا نکتہ ہمارے ارباب حل و عقد کی سمجھ میں آ سکے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ یونی ورسٹیاں یہ کہ قوالی یا ہر ہنگامے کے آگے سپر ڈال دینا، پولیس کی پہرہ داری یا سیاسی پارٹیوں کی ایجنسی، وہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ طلبہ میں سیاسی شعور ہونا چاہئے۔ طلبہ اس سیاسی شعور کا مظاہرہ اپنے مباحثوں میں اور مہذب احتجاج کے ذریعہ سے بھی کر سکتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے بھی یہ آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کر سکیں مگر اساتذہ کو سیاسی کارکن کے بجائے اثر (INFLUENCE) ہونا چاہئے اور طلبہ کو سیاسی مداریوں کی کٹھ پتلی کے بجائے ایسی فصل جس پر کانٹے

(باقی صفحہ ۱ کا نمبر پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا